(1910–1829)

محمد حسین آزاؔد اردو کے اہم ادیب اور شاعر تھے۔ وہ ذوقؔ دہلوی کے شاگرد اور دہلی اردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ آخر میں وہ لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔

لاہور میں انھوں نے انجمن پنجاب کی زیرِنگرانی ایک نئے انداز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں شاعر دیے گئے عنوانات پر نظمیں سناتے تھے۔یہیں سے اردو میں جدید نظم نگاری یا جدید شاعری کا آغاز ہوا۔

محمد حسین آزاؔد اچھے شاعر ہی نہیں بلند پایہ انشاپرداز بھی تھے۔ ’آبِ حیات‘، ’دربارِ اکبری‘، ’نیرنگِ خیال‘، ’سخن دانِ فارس‘ وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔انھوں نے بچّوں کے لیے اردو ریڈرس اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ محمد حسین آزاؔد صاحب طرز ادیب ہیں۔ان کی نثر شگفتہ اور سجی ہوتی ہے۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سُقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دُنیا کی مُصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کردیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جولوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کومصیبت اور پہلی مُصیبت کوغنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مُصیبت کو اچھّا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وُسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی اور خواب میں دیکھتا ہوں کہ سُلطانِ افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خُلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں میدان میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور اُن کے تماشے کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مُصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہوگیا۔

ایک شخص سؤکھا، سہا، دُبلا پے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پُھرتی سے پھر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن، دامنِ قیامت سے بندھا تھا۔ اُس پر دیوزادوں اور جنّاتوں کی تصویریں، زردوزی کڑھی ہوئی تھیں اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اُس پر نظر آتی تھیں۔ اُس کی آنکھیں وحشیانہ تھیں مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اُس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقامِ مقرّرہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتے دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اُس نے ذرا میرا دل بہلایا صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پُرانے سے چکن کے چُغے میں ایک بھاری سی گٹھری لیے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا، اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا۔ اُس نے بھی اپنا بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ وہ اس کی جورو تھی جو بہت بُری تھی اُس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جن کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دؤدِ آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انھیں میں آہوں کے تیرِ خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اَب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جدّ وجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ بہت بُڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جُھرّیاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اُس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے، مگر خوشی خوشی اُٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کُبڑا ہے اور آدم زاد کے انبارِ رنج والم میں اپنے کُبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اُس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مُصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سُقم اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمیوں نے خواہ مخواہ اُنھیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں اُن سب کا مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے، مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بداطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں یہ کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضُعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش! کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاّش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اُٹھائے بے پروا چلا آتا ہے۔ اُس نے بھی ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اُتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے، مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ اُن کو اپنی طرف آتے دیکھ کر

میرے حواس اُڑ گئے مگر اُنھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اُس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ جی بے زار ہوگیا اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اُتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اُتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اُس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے جو سُلطان الافلاک کی بارگاہ سے حُکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کر لیں اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سُنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی پُھرت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکّا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزّز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال واملاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اُس نے دردِ مذکور کو پھینک کر ایک خوب صورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سر شوری کے سبب سے دِق ہو کر اُس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اُس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بُڈّھے کی داڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیّار ہوا۔ اتّفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ دردِ قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈّھے نے اُس سے کہا کہ برائے خُدا میرا دردِ قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لے لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ ہوسکتا تھا۔

ایک بے چارہ جہازی غُلام تھا کہ اُس نے قیدِ زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دِق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھوٗلے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اُسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا اور سر پکڑے بسور رہا تھا۔

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لیا تھا اور وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، اب وہ جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اُسے چھوڑا تھا۔ اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا اور اس طرح برعکس غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں اپنی ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے سفید بالوں کو چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے! ہائے! کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی مگر چوں کہ سینہ اور بازو بھی دُبلے تھے، اس لیے پتلی

کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوب صورتی لی تھی، مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی بہ نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مُصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہار نے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں اُن کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اُس بڈّھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوب صورت سجیلا جوان بن کر چلا مگر مثانے میں ایک پتھری پیدا ہوگئی تھی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی تھی، کھوے سر سے اونچے نکل آئے تھے اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں اُن کا غول گرد تھا یہ اُنھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف صاف نہ گزرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کی صورت حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنُما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا مگر ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی۔ کیوں کہ جب میں اپنی پیشانی سے عرقِ ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکّر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا، ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مُٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا اُس نے ایک لم ٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا، وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلّیوں پر چلا جاتا تھا۔ سر کا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اُڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمالِ کوشش سے قدم اُٹھاتا تھا مگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھنچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالتِ غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں! اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سو دَمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا اَنبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا یعنی ان سے بے زار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہِ افسوس سے دُھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر میں سُلطان الافلاک کو بے کس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا اور حُکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ اُنھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی اُن وبالوں کو سر و گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حُکم

آیا کہ وہم جس نے اُنھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اُس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اُس کی حرکات وسکنات نہایت معقول و باوقار تھیں۔ اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اُس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکّل کر کے نگاہ کو اُسی کی آس پر لگا دیا۔ اُس کا نام صبر وتحمّل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مُصیبت کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کوہِ مذکور خود بہ خود سمٹنا شروع ہوا، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثُلث رہ گیا۔ پھر اُس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اُٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھا تا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بُردباری کے ساتھ اُٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضا مند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اُس کا شکر یہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لا انتہا میں سے اپنا بارِ مُصیبت چُننا نہ پڑا۔

(محمد حسین آزاد)

مشق

سوالات

1۔ سُلطانِ افلاک کے دربار سے کیا اشتہار جاری ہوا؟

2۔ وہم کا کیا حُلیہ بتایا گیا ہے تفصیل سے لکھیے؟

3۔ لوگ اپنی پہلی مصیبت سے چُھٹکارا کیوں پانا چاہتے تھے؟

4۔ مصیبتوں کو بدلنے کے بعد لوگوں نے خود کو کیسا محسوس کیا؟

5۔ اپنی اپنی مصیبتوں کو بدلنے کے بعد بھی لوگوں کی پریشانیاں کم کیوں نہیں ہوئیں؟

6۔ صبر وتحمّل کا بیان کس طرح کیا گیا ہے؟